

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اشارات

روزوں کا مہینہ — ماہِ صیام — جب آتا ہے تو جہاں کہیں وبا دیا اسلام بھی موجود ہوتا ہے، اس کی غرض و فضا میں پھیل جاتی ہے۔ مسلمانوں کے جس گھر یا جس بستی یا جس ملک پر اس ماہِ مبارک کا پد تو پڑتا ہے، اس کا نقشہ عام حالات سے بدل جاتا ہے۔ تارکِ نماز لوگ کپڑے پاک کر کے صفِ نماز میں اکھڑے ہوتے ہیں، احکامِ دین کی پابندی سے آزاد رہنے والے مرد و زن روزہ دار ہو جاتے ہیں، گھروں اور مسجدوں میں قرآن پڑھا جانے لگتا ہے، کچھ لوگ اسی مہینے میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، بصورتِ دیگر عام صدقات دینے کے لیے ہمتہ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ سحری اور تراویح اور افطار کے سلسلے بالکل نئی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بعض غلط مشاغل یا آدمیوں یا جرائم کے پروگراموں کو اس مہینے میں معطل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ ظاہری علامات ہیں جو اس حدیثِ رسولؐ کی تصدیق کرتے ہیں کہ شیطاں ماہِ رمضان میں پابجولاں کر دیے جاتے ہیں۔

قرآن و سنت کے سرِ پایہ علم و حکمت سے یہ حقیقت اخذ ہوتی ہے کہ ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی ایک شیطان اُس پر مامور ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے اس کی ملکوتی قوتوں کو بے اثر بنائے اور سفلی رجحانات کو ابھار کر عصیان و طغیان کی راہ پر اُسے گامزن کر دے۔ اب اگر کوئی صاحبِ ایمان فرد ماہِ صیام کا حق ادا کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، اپنی جسمانی ضرورتوں اور خواہشات کو احکامِ الہی کے تابع کر دیتا ہے، قرآن پڑھتا ہے اور سنتا ہے، نماز باجماعت خصوصاً تراویح

کے مجھے میں شریک ہوتا ہے، سحر و افطار کے وقت مسنون کلمات ذکر و دعا ادا کرتا ہے، کچھ خیرات کتا ہے، بعض لوگوں کا روزہ افطار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا شیطان تو زنجیروں میں جکڑا گیا اور بالکل بے بس ہو کے رہ گیا۔ اس طرح گویا ہزار ہا مسلمانوں کے ساتھ لگے ہوئے شیاطین کے لیے کام کے راستے بند ہو گئے اور وہ مقید ہو کے رہ گئے۔

یہ حدیث جب کبھی بیان ہوتی ہے تو کچھ حضرات یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر شیاطین قید ہو جاتے ہیں تو پھر بُرائی دنیا میں کیوں باقی رہتی ہے۔ اس کے جواب میں چند نکات قابل غور ہیں۔

۱۔ اہل کفر و شرک اور ایسے جرائم کار جن کی فطرت سلیم تباہ ہو چکی ہو، ایسے ظالم اور مستبد اور متکبر لوگ جنہوں نے اپنے جوہر انسانیت کو غارت کر دیا ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اسیر شیاطین والی حدیث کا اطلاق اُن پر، اُن کی بستیوں اور اُن کے ممالک پر کیا جائے۔ مثلاً پہلا ماہ صیام جب روزے فرض کیے گئے تھے، عین اسی مہینے کے وسط میں میدان بدر میں وہ پہلا معرکہ حق و باطل گرم ہوا جس کا ایک فریق مسلمان تھے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کمان میں جانیں لڑا رہے تھے، اور دوسرا فریق قریش مکہ اور اُن کے حلیف تھے جو پیغمبر خدا اور مسلم جماعت کو مٹا دینے کے ارادے سے اُٹھے تھے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ مدینے کے مسلمانوں پر کام کرنے والے شیاطین تو مقید تھے، لیکن اشرار مکہ کے شیاطین کو قید میں ڈالنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔

۲۔ شیاطین کا کام ایسا ہے کہ جیسے چھوٹ لگا دینا۔ وہ جب ظلم و شر اور عصیان و طغیان کے جراثیم انسانی قلب میں اُتار دیتے ہیں تو اگر ایمان و ضمیر میں قوتِ مدافعت ہو تو وہ کچھ روک سکتا کرتا ہے۔ مگر شیاطین بھی طیر پا کے مچھر کی طرح بار بار اور روز روز جراثیم کی نئی کھیپ اندر داخل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی قلب و ضمیر میں مرضِ جڑ پکڑ لے۔ اب اگر شیاطین قید میں بھی ہوں تو ان کا کام جاری رہتا ہے۔ اُن کے بوٹے ہوئے بیج اگر کسی مٹی میں جگہ پا چکے ہوں تو روئیدگی کا سارا عمل خود بخود ہوتا رہے گا۔ اس دور میں "آٹومیٹک کنٹرول" کی اصطلاح عام ہے۔ شیاطین بھی اپنے زیر اثر انسانوں میں عادت کے قانون کے ذریعے ایک طرح کا آٹومیٹک کنٹرول پیدا کر دیتے ہیں۔

شیاطین تاک کر ذہین لوگوں اور اہم شخصیتوں اور با اثر اکابر اور نوجوان ایچی ٹیٹرز پر اپنا جادو چلاتی ہیں یا شیطنیت کے جراثیم ان کے اندر آثار فی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خود شیاطین کے کان کترنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اب شیاطین جن کا کام ختم ہو گیا۔ انہوں نے شیاطین انس تیار کر کے میدان میں آثار دیے۔ اب خود انہیں تو صرف جائزہ لینے رہنا ہے اور رپورٹیں اور اعداد و شمار مرتب کرنے کا اہتمام رکھنا ہے۔

اس بار ماہ سیام آیا تو معاشرے کا رنگ ذرا سا بدلا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں شیطانوں کو زیادہ بھاری زنجیریں پہنائی گئی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا رمضان ہے جس میں کم سے کم لاہور کی حد تک جہاں تک میرا مشاہدہ محدود ہے، بالعموم ایسا نہیں ہے کہ لوگ چلتے پھرتے سگریٹ پی رہے ہوں، یا پانی کی دکانوں پر کوکا کولا اور سیون آپ سے شاد کام ہونے والوں کی قطاریں لگی ہوں یا چھوٹے بڑے ہوٹلوں، تنوری طعام خانوں اور اشیائے خوردنی و نوشیدنی بیچنے والے ”فٹ پائٹھیوں“ نے چادریں تان رکھی ہوں اور ایسے مریضان عشق ہر جگہ ہجوم کیے ہوئے ہوں جو زبان حال سے ایک بہت پرانی مشہور سی غزل کا یہ مصرعہ آپ رہے ہوں کہ ”میں مریض عشق ہوں، میری دوا پردے میں ہو“ اب کے وہ پردے والے مریضان عشق بھی غائب ہیں، اور بناء بریں پردے بھی غائب! طعام اور شربت وغیرہ کی دکانیں کہیں تین چار بجے شام کو کھلتی ہیں۔ دوپہر یا قبل دوپہر کو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی نے پانی کی دکان سے فانا یا آرسی کی بوتل مانگی اور دکاندار نے انکار کر دیا۔

یہ تبدیلی اس حد تک صرف اس درجہ سے ہوئی ہے کہ مسجدوں میں خطبوں اور کتبانی اور اخباری تحریروں کے ذریعے تو پہلے ہی احترام رمضان کی تلقین کی جاتی رہی ہے، اور بہت سے لوگ اسی تلقین کی وجہ سے رضا کارانہ طور پر احتیاط کرتے ہیں۔ مگر جب چیف مارشل لائیو انسپکٹر نے ابتدائے رمضان کے وقت احترام رمضان کی اپیل کی ہے اور اس کے لیے حکومت اور اس کے کارندے نیک نیتی اور مستعدی سے حرکت میں آگئے ہیں تو پھر کیسے رمضان کے ساتھ وہ مذاق روا رکھا جاسکتا ہے جو

ہمارے ہاں کے بڑے اور چھوٹے دنیا پرستوں اور شکم پرستوں نے روارکھا ہے۔

دوسرا اچھا شگون یہ ہے کہ مذکورہ صورتِ حالات گواہی دیتی ہے کہ پاکستانی قوم جیسے بھی بڑے احوال سے دوچار چلی آرہی ہے، اگر اس کی اصلاح صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کی جائے تو اسے ہر قسم کی پستیوں سے نکالا جاسکتا ہے۔

ہم اسی تصور کے تحت کام کر رہے ہیں کہ ایک طرف دعوت و تلقین اور تربیت و تزکیہ کا کام ہونا چاہیے، دوسری طرف حکومت کو اجتماعی پہلو سے جو حقہ کسی امر کے نفاذ یا انسداد کے لیے ادا کرنا لازم آتا ہے، وہ اسے کرنا چاہیے، اور پھر یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ قوم خیر و فلاح کی طرف ہی پلکے گی۔

احترامِ رمضان کا یہ تصور بڑا کثیر درجے اور منفی نوعیت کا ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ اصل احترامِ رمضان یہ ہے کہ رمضان آئے تو آدمی عبادت و طاعت کے لیے کمر کس لے۔ احترامِ رمضان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ روزے رکھے جائیں، تراویح ادا کی جائے، قرآن کو پڑھا، سنا اور سمجھا جائے اور اس کو سرمایہ عمل بنایا جائے۔

احترامِ رمضان یہ ہے کہ جھوٹے بولنے اور جھوٹے فلسفوں اور جھوٹے تصورات پر عمل کرنا ترک کیا جائے، غیبت، چغلی، بدزبانی اور بہتان بازی سے اجتناب کیا جائے۔

اور احترامِ رمضان ہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا نہ تو ذخیرہ کیا جائے، نہ انہیں زائد منافع کے لیے فروخت سے روکا جائے، نہ ناپ تول میں فرق کیا جائے اور نہ گراں فروشی کی راہ اختیار کی جائے۔ اس ایک مہینے میں خدا اور رسولؐ کی محبت اتنی تو کار فرما ہونی چاہیے کہ بڑے بیوپاری اور چھوٹے کاروباری بہت ہی کم منافع پر اکتفا کریں، یا بعض صورتوں میں کوئی چیز بغیر منافع کے فروخت کریں، اور زیادہ بلند مقام یہ ہے کہ نقصان اٹھا کر بھی خدا کے بندوں کو سہولت دی جائے۔ یقیناً اس اشارے کے بدلے میں اللہ تعالیٰ بقیہ گیارہ مہینوں میں ایثار کرنے والوں کو خاص برکات سے نواز سکتا ہے۔

ہمارے یہاں پہلے ایک روشن مثال ایسی قائم ہو چکی ہے کہ اُسے دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ آج بھی ایسا ممکن ہے۔ جہاں ستمبر ۱۹۶۵ء کے دنوں میں اشیاء کی رسد میں مشکلات غیر معمولی تھیں، مگر لاہور کی حد تک تو میں گواہی دیتا ہوں کہ یہاں ضروریات کے نرخوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اگر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ایسا ہو سکتا تھا تو اب اگست ۱۹۶۸ء میں وہی کچھ کیوں نہیں ہو سکتا۔

میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ سوچتا ہوں کہ شہروں کے ہر محلے اور باہر کے ہر گاؤں میں ایسے لوگ ہونے چاہئیں تھے جو افطار یا غذا کے مختلف سامان خرید کر باری باری روزہ داروں کو مختلف دنوں میں مفت فراہم کرتے۔ مثلاً کوئی صاحب اپنے گھر کے آس پاس کے دس، بیس یا سو پچاس گھروں میں کس دن مفت گوشت تقسیم کر دیتے، کسی دن کوئی صاحب پاد پاد بھرا گوریا کھجور کے دو چار درجن پکیٹ بانٹ دیتے۔ ایک ایک حلقے میں اگر ایسے دس دس اہل غیر آگے آجاتے تو معاشرے کی فضا بے حد متاثر ہوتی۔ شاید دکانداروں کو بھی گراں فروش پر شرم آنے لگتی۔ مختلف فرموں کی طرف سے ایسا سلسلہ خیر جاری ہو سکتا تھا۔

ان ساری چیزوں کے بعد احترام رمضان کی وہ شکل بھی سامنے آتی ہے کہ اگر کوئی شخص بیماری یا مسافرت یا کسی اور وجہ سے روزہ نہ رکھ سکا ہو تو کم سے کم اُس کی روزہ خوری کا حال دوسروں پر کھٹکنا نہیں چاہیے کہ یہ روزہ خوری کی تبلیغ کی ایک صورت ہے۔ ایک کو دیکھ کر دوسرا جمہات حاصل کرتا ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ اس مرتبہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے خود ہی افتتاح رمضان کی تقریر میں یہ ضرورت ظاہر کر دی کہ یوم پاکستان یا یوم استقلال ۲۷ رمضان المبارک کو منایا جانا چاہیے۔ فی الحقیقت دور نبوت کے ساتھ رمضان کے سلسلے میں پاکستان کو ایک مبارک نسبت حاصل ہے۔ دہن مدینہ کی اسلامی ریاست کا ظہور عام غزوہ بدر سے ہوا۔ اور غزوہ بدر اس پہلے ماہ صیام کے وسط میں واقع ہوا جس میں روزے فرض کیے گئے تھے۔ پھر یہی رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ بھی ہے۔ پاکستان کی تشکیل کا اسی مہینے میں واقع ہونا اپنے اندر ایک بشارت رکھتا ہے۔

یہ تو ہماری بد قسمتی تھی کہ انگریزی دور کے مستط کردہ عیسوی کیلنڈر نے ہمارے ہجری کیلنڈر کو دبائے رکھا۔ اب اگر پاکستان میں ہجری کیلنڈر کو اہمیت دی جائے اور "ایام اللہ" پر ہماری نظریں مرکوز ہوں تو ہمارے بہترین جذبات کی آبیاری ہو سکتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسی سال یوم استقلال ۲۴ رمضان المبارک کو منانے کا اعلان ہو جاتا اور اس کی تعمیل ہو جاتی۔

اب یہ سعادت آگے کے لیے ملتوی ہو گئی ہے۔

باقی رمضان المبارک کی چھڑ گئیں، حالانکہ جب یہ اوراق قاریں تک پہنچیں گے تو یا تو وہ عید منارہے ہوں گے، یا اس کے لیے تیاریاں کر رہے ہوں گے۔

ہماری عید کا مرکزی جوہر نماز عید اور صدقہ فطر اور تکبیرات ہیں۔ یہ ہماری مخصوص اسلامی تہذیب ہے کہ ہم یوم مسرت بھی مناتے ہیں تو خدا فراموشی کی کیفیت نہیں ہوتی۔ ہم ایک لمبے دور عبادت کی آزمائش و تربیت کے دور سے کامیابی کے ساتھ گزرنے پر خدا کے شکر کے طور پر عید الفطر مناتے ہیں۔ ہر چند کہ اچھے کپڑے پہننے اور اچھے کھانے کھانے اور عزیزوں دوستوں سے میل ملاقات اور بچوں کی تفریح اور جائزہ قسم کے کھیل تماشوں کی گنجائش دی گئی ہے۔ مگر عید الفطر کو کسی ایسے طریق سے نہیں منانا چاہیے کہ رونے رکھ کر اور تراویح پڑھ کر اور قرآن مجید کی تلاوت کر کے اور صدقہ و خیرات کے جو کردار پیدا کیا گیا ہو، اُسے طوفان مسرت میں ڈبو دیا جائے، اور پھر سارا سال اس طرح گزرے کہ نہ خدا کا خوف، نہ رسول کی محبت اور نہ آخرت کے حساب کتاب کا تصور۔ بس جہازِ عمر رسول پر سوار بنانے کا حسرت سے کدھر جا رہے ہیں۔

عید اس طرح منانی چاہیے کہ ماہِ میام کی برکات ہمارے ساتھ رہیں اور سارا سال ہمارے لیے زادِ راہ بنی رہیں۔